ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

ڈاکٹر عنبر فاطمہ عابدی ❁

مصطفیٰ زیدی کے مرثیے ''کربلا اے کربلا'' کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

A Research and Critical Study of Mustafa Zaidi's Marsiya *Karbala Aye Karbala*

By *Dr. Ambar Fatima Abidi, Lecturer Urdu, Shaheed Zulfiqar Ali Bhutto University of Law, Karachi*

ABSTRACT

Mustafa Zaidi (1930-1970) a well-known poet and a talented CSP officer whose work especially in (Urdu Nazm and Ghazal) had been appreciated by such literary stalwarts as Josh Maleehabadi and Firaq Gorakhpuri. The initial phase of Zaidi's poetry was a romantic one, in every sense of the word, but gradually he began to deplore the ruthless realities of a more wearisome nature and turned sour. The interesting fact is that, though Zaidi was not a conventional religious person, his poetry reveals his deep association with religious affairs. He used Karbala as a Metaphor in many of his poetic expressions. In the last phase of his life, he was writing a marsiya named *Karbala Aye Karbala* but due to his untimely death, it remained incomplete. He wrote 150 couplets of this marsiya which indeed are a significant addition in the Urdu Marsiyas. In this research paper, a detailed critical analysis of Karbala Aye Karbala has been made with keeping in view to reveal its literary significance among the others of the same genre.

Keywords: Mustafa Zaidi, Karbala, Poetry, Marsiya.

مصطفیٰ زیدی ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۰ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ مصطفیٰ

❁ لیکچرر اردو، شہید ذوالفقار علی بھٹو یونی ورسٹی آف لا، کراچی

زیدی کا شمار ان شعرائے اردو میں ہوتا ہے جنھوں نے انتہائی کم سنی ہی سے میدان شاعری میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ اپنے قدموں کو اپنی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں سے جما بھی لیا۔ ابتدا میں ''تیغ الٰہ آبادی'' کے تخلص سے شہرت پانے والے مصطفیٰ زیدی کا پہلا شعری مجموعہ ''زنجیریں'' ۱۹۴۷ء میں اس وقت شائع ہوا جب ان کی عمر محض سترہ برس تھی۔ ''زنجیریں'' میں شامل ان کے شعری افکار اور ان سے عیاں تخلیقی قوت نے دنیائے ادب پر یہ ظاہر کر دیا کہ ان کی عمر اگر چہ کم ہے تاہم افکار اور اشعار انتہائی پختگی کے حامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ زیدی کو ان کے عہد کے جیّد و مستند شعرا سے داد و تحسین بھی ملی اور آگے بڑھنے کی حوصلہ افزائی بھی۔ ''زنجیریں'' کا مقدمہ تو لکھا ہی فراق گورکھ پوری (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۸۲ء) نے تھا اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کچھ اس طرح کیا تھا:

> میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس سن و سال میں شاید ہی کسی شاعر کا کلام سلجھا ہوا اور سانچے میں ڈھلا ہوا دستیاب ہو سکے گا... حضرت جوش ملیح آبادی کسی سترہ سال کے لڑکے کا کلام دیکھ کر یہ نہیں لکھ سکتے تھے کہ ''آپ کے کلام سے آپ کی خوش گوئی اور خوش مزاجی کا میرے دل پر بہت اچھا اثر پڑا۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ آپ مستقبل کے ایک بڑے شاعر ہیں۔'' بشرطے کہ کلام میں شاعرانہ کشش نہ ہو، باغی اور سرکش روح کی پکار نہ ہو اور شاعرانہ عظمت کے نشانات نہ پائے جائیں۔[۱]

مصطفیٰ زیدی نے جب اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تو اس وقت ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے اثرات پورے ادبی منظر نامے پر چھائے ہوئے تھے، یقیناً وہ بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکے۔ پھر یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ الٰہ آباد میں زمانۂ طالب علمی میں انھیں ایسا ادبی ماحول میسر آیا جو اُن کی فکری جلا و بقا اور شاعری کو پروان چڑھانے میں معاون رہا۔ یونگ کرسچین کالج اور الٰہ آباد یونی ورسٹی میں تعلیمی مراحل طے کرنے کے دوران ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی و فکری تربیت کا سامان بھی ہوتا ہے۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی میں انھیں جن اساتذہ کی صحبت نصیب رہی، ان میں فراق گورکھ پوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور پروفیسر مسیح الزماں جیسے قابل اور مستند اور علم دوست شخصیات شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے نخلِ شعر کو ایک تناور درخت بنانے میں الٰہ آباد کی شعر و ادب کی حامل فضا نیز سخن شناس اور علم دوست مصاحبین کی معاونت و رہنمائی شامل رہی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سیّد محمد عقیل جو اُن کے دوست اور ہم جماعت بھی تھے، یہ تحریر کرتے ہیں:

> الٰہ آباد اس وقت اتفاق سے اچھے شعرا کا مرکز بن گیا۔ فراق، وامق جون پوری، راہی، مسعود اختر جمال، مظفر شاہ جہان پوری گاہے ماہے مجاز، یہاں سب موجود

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

رہتے۔ انجمن ترقی پسند مصنّفین کی نشستوں میں اس وقت اوپندر ناتھ اشک اور بلونت سنگھ بھی شامل ہوا کرتے۔ دلچسپ بحثیں ہوا کرتیں۔ تیغ نے اپنی اس چھوٹی سی عمر میں جو حیثیت بنالی تھی، وہ یقیناً ہر اُبھرتے ہوئے فن کار کے لیے باعثِ رشک ہوسکتی ہے۔(۲)

ڈاکٹر محمد عقیل کی اس رائے کے تناظر میں اگر مصطفیٰ زیدی کے شعری مجموعوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے، ان کے کلام میں جاذبیت و تاثیر کے علاوہ ظلم و جور کے خلاف بغاوت اور سماج سے بغاوت کی جو لہریں ابتدا میں موجود تھیں، وہ پوری توانائی اور روانی کے ساتھ ان کے کلام میں آخر تک موجود رہیں۔ ''زنجیریں'' سے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت کروانے اور ممتاز شعرا سے پذیرائی حاصل کرنے کے دوران ہی ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''روشنی'' ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی سے گریجویشن کے بعد زیدی نے پچاس کی دہائی میں پاکستان آنے کے بعد انگریزی میں ماسٹرز گورنمنٹ کالج، لاہور سے کیا۔ پھر کراچی اور پشاور کے مختلف کالجوں میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں سی ایس ایس کے امتحان میں کامیاب ہوکر مختلف عہدوں پر اپنی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے شعری سفر کو بھی جاری رکھا۔ اس عرصے میں شعری دنیا کے اُفق پر ان کے افکار و رجحانات کی وسیع و عمیق ترجمانی کرتے ہوئے ''شہرِ آذر'' (۱۹۵۸ء)، ''موج مری صدف صدف'' (۱۹۶۰ء)، ''گریبان'' (۱۹۶۴ء) اور ''قبائے ساز'' (۱۹۶۷ء) نمودار ہوئیں۔ اس ضمن میں ''شہرِ آذر'' اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے آغاز میں فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء) کے مصطفیٰ زیدی کے حوالے سے توصیفی کلمات کچھ یوں درج ہیں:

> جذباتی اور غیر جذباتی، ڈرامائی اور غیر ڈرامائی ہر نوع کی جزئیات کے بیان میں ان کا کلام بلیغ اور مؤثر شاعری کی سطح سے نیچا نہیں آتا۔ ان کا راز ان کے شعور کی پختگی بھی ہے۔ ان کی فنی لطافتِ احساس بھی۔ وہ سپردگی اور آگہی، سرمستی اور باریک نگاہی جو ایک صحیح فن کار کے ذہنی اعتبارات ہیں، زیدی کے شاعرانہ ذہن میں ان کا صحیح امتزاج موجود ہے اور اس کے ساتھ نزاکتِ اظہار کا ملکہ بھی۔ اسی سبب سے زیدی کا شعر ہماری جدید شاعری میں ایک انوکھا، پُراسرار اور دل کش اضافہ ہے۔(۳)

''شہرِ آذر'' کے دیباچے میں مصطفیٰ زیدی نے اپنے تخلص تیغؔ الٰہ آبادی کو خیر باد کہنے کے حوالے سے ''ایک

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

آخری بات'' کچھ اس طرح بیان کی ہے:

> یہ جتنی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، میری نہیں ہیں بلکہ تیغ الٰہ آبادی کی ہیں۔ تیغ الٰہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے، لیکن آخر انھیں علاحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا تھا۔ لیکن آخر تخلص کے بغیر بھی گزر ہو ہی سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی تخلص کے علاوہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ مصطفیٰ زیدی سے ابھی تک میں ہی مانوس نہیں ہوا ہوں، آپ کو تو شاید اور بھی مدت درکار ہو۔[۴]

اس حوالے سے مصطفیٰ زیدی کی شاعری یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ جب تک ''تیغ'' تخلص کرتے تھے، اس وقت بھی وہ باغیانہ اور انقلابی رجحانات کی طرف مائل تھے اور جب اس تخلص کو ترک کیا، تب بھی مصلحت پسندانہ سوچ، اندیشہ ہائے دور دراز اور تصنع و بناوٹ سے بے نیاز مائل بہ پرواز رہے۔ ان کی شاعری کے یہ زاویے ان کی ذاتی زندگی کا بھی اظہار ہیں۔ زیدی کے یہی منفرد افکار ہیں کہ جن کی وجہ سے ڈاکٹر ممتاز حسین نے ان کے حوالے سے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ:

> ان کی شاعری میں ایک قوت ہے۔ ان کے بیان میں ایک گرمی ہے جو انھیں موجودہ نسل کے شعرا سے ممیز کرتی ہے۔ وہ جذبات اور احساسات کے شاعر ہیں اور اپنی کیفیات اور واردات کے ترجمان ہیں۔[۵]

۱۳/ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو محض ۴۰ سال کی عمر میں کراچی میں اپنی رہائش گاہ میں پُراسرار حالات میں مردہ پائے جانے والے مصطفیٰ زیدی نے اپنی بے وقت موت اور پوشیدہ قاتلوں کو اپنے اس شعر میں اپنی زندگی میں ہی یوں واضح کر دیا تھا۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے[۶]

ان کی موت پر یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ حساس، تیز طبع اور مفکر شاعر بعض اوقات انسانی ہمدردی میں کچھ ایسے لوگوں میں پھنس جاتے ہیں جو اُن کے قتل کا موجب قرار پاتے ہیں۔[۷] مصطفیٰ زیدی کا آخری مجموعۂ کلام ''کوہِ ندا'' ان کی موت کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ یوں تو ان کا شعری سفر جو ''زنجیریں'' سے شروع ہو کر ''کوہِ ندا'' پر اختتام پذیر ہوتا ہے، ان کے فکری زاویوں، باغیانہ رویوں اور انقلابی رجحانات کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ تاہم

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اس کے علاوہ ان کی شاعری کا اہم رُخ وہ رثائی عناصر بھی ہیں جو مذہب وعقیدے کو محض روایت کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ واقعۂ کربلا سے وابستگی اُن کے کلام میں معاشرے میں موجود ناانصافی، ظلم و جور، محرومی اور جبری تسلط سے نجات دلانے کا محرک بن کر اُبھرتی ہے۔ ان کے الفاظ ایک ایسے احتجاج کا روپ دھار کر سامنے آتے ہیں جو کھلے عام باطل کو باطل اور حق کو حق تسلیم کرنے کی قوت و ہمت رکھتا ہے۔ اور یہ طاقت انھیں فکری و روحانی طور پر کربلا کے کرداروں سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے زیدی کے اس شعری زاویے کے حوالے سے یہ لکھا ہے کہ:

> ان کی شاعری میں جو تشبیہات اور استعارے نظر آتے ہیں ان میں کربلا ایک ایسے تاریخی تناظر میں اُبھر کر آئی ہے جس کا تعلق اس احتجاجی لہجے سے بھی منسلک ہوجاتا ہے جس کی گونج جوش کے مرثیوں اور ان کی انقلابی شاعری میں پورے جاہ وجلال سے سنائی دیتی ہے! آلِ رسول ﷺ کے حوالے سے صرف حق، ایثار و وفا اور شہادت کا تذکرہ ان کی شاعری میں ایک ایسے رُخ سے موجود ہے جس سے ان کی شخصیت اور افکار کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔[۸]

ڈاکٹر ہلال نقوی کی اس رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے مصطفیٰ زیدی کی شاعری کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے، وہ اپنے شعری افکار میں جس شاعر سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ جوش ملیح آبادی تھے۔[۹] لیکن یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ انھوں نے جوش کی نقالی نہیں کی اور خود کو شعوری طور پر جوش کے اثرات سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے پُرشکوہ لفظیات، نئی اور جدید تراکیب اور لہجے کی گھن گرج میں اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

علم سقراط کی آواز ہے عیسیٰ کا لہو   علم گہوارہ و سیارہ و انجام و نمو
علم عباس علم دار کے زخمی بازو   علم بیٹے کی نئی قبر پہ ماں کے آنسو
وادیِ ابر میں قطروں کو ترس جائے گا   جو ان اشکوں پہ ہنسے گا وہ جھلس جائے گا[۱۰]

ایک اور نظم میں وہ کربلا اور بیت المقدس میں ہونے والے ظلم، نیز حضرت عیسیٰ کے صلیب چڑھنے والے واقعات کو باہم مربوط کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں:

کوئی آیا ہے مجھے آگ لگانے کے لیے   صحن بے چار گئی مسجدِ اقصیٰ مددے
حلقِ اصغر کی طرف ایک کمان اور کھنچی   اے ہواؤں کے رُخ، اے گردشِ صحرا مددے

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اک رسن اور بڑھی سُوے سکینہ ہشیار اک صلیب اور ہوئی درپئے عیسیٰ مددے[۱۱]

مصطفیٰ زیدی کے کلام میں اس طرح کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شعری افکار کے سلسلے کربلا سے بھی منسلک تھے۔ تاہم یہ امر بھی دل چسپی کا باعث ہے کہ ان کی روحانی شاعری میں جہاں کربلا سے تشبیہات و استعارات کشید کیے گئے ہیں، وہیں وہ معاشرے میں، غرض دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو، چاہے اس کا تعلق کسی بھی قوم و مذہب سے ہو، اسے منظرِ عام پر لانے کے لیے کربلا کا رُخ کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک کربلا محض عقیدے کی بنیاد پر وابستگی کا سبب نہیں بلکہ ظلم و جور، معاشرتی ناانصافیوں اور محرومیوں کی بہترین عکاسی کا سامان بھی ہے۔ ان کے نزدیک کربلا گویا ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں دنیا بھر کے مظلوم اپنے حقوق کے لیے، انصاف کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ زیدی کی شاعری کا عمیق مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر انھیں موت مہلت دیتی تو قوی امکان تھا وہ اپنی انقلابی سوچ کو معاشرے میں روا ظلم و جور اور ناانصافیوں کو اجاگر کرنے کے لیے اپنی شاعری میں ''مرثیہ'' بطور صنف برتتے۔ اپنی زندگی میں انھوں نے ایک مرثیہ لکھا بھی تھا، تاہم وہ نہ صرف یہ کہ نامکمل رہا بلکہ جتنا لکھا تھا، وہ بھی مکمل طور پر دستیاب نہ ہوسکا۔ اس ضمن میں اُن کے چھوٹے بھائی نے یہ تحریر کیا ہے کہ:

> میرے بڑے بھائی سیّد مصطفیٰ زیدی (مرحوم) ایک مرثیہ ''اے کربلا، اے کربلاٗ'' لکھ رہے تھے جس کے ۱۵۰ سے زائد لکھے جاچکے تھے اور ابھی یہ نامکمل ہی تھا کہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی صبح کراچی کے ایک فلیٹ میں جہاں وہ رہتے تھے، ان کی لاش ملی۔ اس طرح یہ مرثیہ تو ہمیشہ کے لیے نامکمل رہا ہی لیکن جتنے بند وہ لکھ چکے تھے، وہ بھی مکمل طور پر ہمیں اس لیے دستیاب نہ ہوسکے کہ ان کی متاعِ حیات کی طرح ان کی ہر متاع حوادث کی آندھی یوں لے اُڑی کہ کچھ سراغ نہ ملا۔ ہم کو ان کی ایک ایسی ڈائری ضرور ملی جس میں ۴۹ بند لکھے ہوئے تھے اور ڈائری پر مرثیے کا خاکہ اور ایسے نکتے درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرثیے کا اُن کے ذہن میں کیا نقشہ تھا۔[۱۲]

''کربلا اے کربلاٗ'' کے صرف ۴۹ بند ہی دستیاب ہوسکے جنھیں ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی کتاب ''مرثیے کی نایاب آوازیں'' میں شائع کیا۔ اس مرثیے کے ان ۴۹ بندوں کا مطالعہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے۔ یقیناً ''کربلا اے کربلاٗ'' مصطفیٰ زیدی کی رثائی شاعری کا اہم اور نمایاں کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ کہ یہ مرثیہ نامکمل سہی،

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

تاہم قوتِ فکر اور ندرتِ الفاظ کے لحاظ سے منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ ''کربلا اے کربلا'' کو نہ تو تنقیدی سطح پر اور نہ ہی تحقیقی سطح پر کوئی اہمیت دی گئی جب کہ یہ زیدی کی رثائی شاعری کا اہم سنگِ میل ثابت ہوسکتا تھا۔ اس مرثیے میں فنی پختگی، تجربات و مشاہدات کو اساس بنا کر انھوں نے مخصوص عقیدتی شاعری ہی پیش نہیں کی بلکہ اس مرثیے کا محور ہر دور میں رائج ظلم و ناانصافی کے وہ جبریہ اصول اور ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہے۔ اسی لیے مصطفیٰ زیدی نے صرف ظلم کی ہی منظرکشی نہیں کی، ظلم کے خلاف، باطل کے مقابل اٹھ کھڑے ہونے کو بھی واضح کیا ہے۔ ''کربلا اے کربلا'' کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ زیدی اپنے افکار و نظریات سے تمام عالمِ انسانیت کو سماجی ناانصافیوں اور ظلم و جور سے آزاد کرانے کے آرزومند بھی ہیں اور کوشاں بھی۔ مرثیے کا آغاز ان کے افکار کو یوں ظاہر کر رہا ہے:

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی — تادیب و جبرِ سلطنت کے درمیاں لکھی گئی
لمحوں کی زنجیروں میں سطرِ جاوداں لکھی گئی — تشریحِ بے عنواں، زبانِ بے زباں لکھی گئی
جتنا شعارِ محتسب دشوار تر ہوتا گیا — اتنا ہی ذکرِ خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا(۱۳)

آگے کے بند میں کربلا کے واقعے سے رونما ہونے والے نتائج اور اثرات کو بیان کرتے ہوئے گویا دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ ظلم کو مٹانے کی کوشش، حق کو دبانے کی کوشش ہمیشہ رائیگاں ہوتی ہے۔ باطل کے سامنے ہمیشہ فتح یاب حق ہی ہوتا ہے۔ ہاں اس راہ میں کئی مرحلے ضرور آتے ہیں۔

اشکوں سے طغیانی اٹھی، آہوں سے افسانے بنے — جلتے ہوئے حرفوں کے خاکستر سے پروانے بنے
ہر خاکِ خوں آلود سے تسبیح کے دانے بنے — ہر تشنگی ساقیِ کوثر کے مے خانے بنے
تردید کی تکرار میں حق کی صدا بڑھتی گئی — جبر و تشدّد میں نوائے بے نوا بڑھتی گئی

تیغوں کا جوہر جل گیا، جھنکار باقی رہ گئی — سیلاب کا رُخ مڑ گیا، دیوار باقی رہ گئی
شامِ وفادارانِ طوق و دار باقی رہ گئی — صبحِ اذانِ سیدِ ابرار، باقی رہ گئی
سقراط کے ہونٹوں کو چھو کر زہرِ قابل مر گیا — کیلوں کا چھوٹا پن صلیبوں کو نمایاں کر گیا(۱۴)

مرثیے کے آغاز سے ہی مصطفیٰ زیدی نے جو طور اپنایا ہوا ہے، وہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے کہ ان کے نزدیک مرثیہ محض روایت کا نام نہیں کہ اگر کوئی شاعر ہے تو وہ رسمی طور پر ہی کربلا کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ضرور رقم کرے، زیدی نے یہ مرثیہ اپنی موت سے چند سال قبل شروع کیا تھا۔ وہ کربلا کو ظلم کے خلاف علامت ہی نہیں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

بلکہ محرک تصور کرتے تھے۔ ایک ایسا ترغیبی محرک جس کی عوام میں جرأت و ہمت پیدا کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے، اس ضمن میں احمد علی سیّد کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے کہ جس میں انھوں نے مصطفیٰ زیدی کے اس مرثیے کے تناظر میں یہ لکھا ہے:

> وہ کہتا تھا بڑی شاعری چالیس سال کی عمر سے پہلے ممکن نہیں۔ گوئٹے نے بھی اپنا شاہکار عمر کے آخری حصے میں مکمل کیا تھا۔ زیدی جس شاعری کو بڑی شاعری سمجھتا تھا، غالباً اب اپنی بے وقت موت سے کچھ عرصہ پہلے اس کی طرف آ رہا تھا، ''کربلا اے کربلا'' اسی خواب کی تعبیر تھی لیکن زیدی جو کچھ پیش کرنا چاہتا تھا اس کو پیش کرنے سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گیا۔(۱۵)

''کربلا اے کربلا'' کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ تاثر ملتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی کے پیشِ نظر جوش ملیح آبادی کے مرثیے ضرور رہے ہوں گے۔ اس حوالے سے یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ زیدی کا طرزِ فکر بھی جوش ہی کی طرح انقلابی اور جدت پسند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاری میں بھی وہ جوش کی فکر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بھائی ارتضیٰ زیدی کے بقول:

> جوش صاحب کے مرثیے ''حسین اور انقلاب'' سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود بھی اس انداز میں اور اسی رنگ میں مرثیہ لکھنا شروع کر دیا۔(۱۶)

یہ حقیقت ہے کہ بیسویں صدی میں مرثیہ نگاری کے اُفق پر سب سے توانا آواز جوش ملیح آبادی کی ہی ہے جو مثلِ سورج بن کر ابھری۔ اور پہلی بار برصغیر میں جدید مرثیے کی بازگشت سنائی دی۔ قدیم مرثیے کو جدید مرثیے سے جو خصوصیت الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قدیم مرثیے کے ذریعے بکائیہ انداز کو زیادہ فروغ ملا ہے جب کہ جدید مرثیہ مقصدِ شہادت کے ذریعے گویا بیداری امت کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ ''کربلا اے کربلا'' کا اسلوب، پُرشکوہ لفظیات، نئی اور جدید تراکیب غرض یہ وہ تمام رُخ ہیں، جن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیدی کے فطری میلانات نے انھیں جوش کے قریب کر دیا تھا۔ تاہم یہاں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ انھوں نے شعوری طور پر خود کو جوش کے اثرات سے بچانے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر جوش کی نقالی کا الزام نہیں لگ پاتا۔ تاہم چوں کہ وہ جوش کے افکار سے متاثر تھے، لہٰذا ان افکار کی جھلک ان کے مرثیے میں بھی نظر آتی ہے۔ جوش امام حسینؑ کو بطور قائد راہِ حق میں استقامت، بیعتِ باطل سے انکار اور شجاعت کے استعاروں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ''حسین اور انقلاب'' اس حوالے سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا رعب و شکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا قرناؤ طبل و ناوک و رایت کا سامنا
لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے (۱۷)

مصطفیٰ زیدی ''کربلا اے کربلا'' میں امام حسینؑ کی مظلومیت تو بیان کر رہے ہیں تاہم ان کے نزدیک حسینؑ مجبور و بے بس نہیں بلکہ حق کے لیے اپنے نفس کے سامنے وقار کے ساتھ سربلند کیے رہنے والی ہستی ہیں۔ جنھوں نے اپنے پورے اختیار کے ساتھ باطل کو سرنگوں کرنے کی ٹھانی ہے۔ اور یہ معرکہ محض کربلا میں ہی نہیں بلکہ حق و باطل کی یہ کش مکش روزِ قیامت تک جاری رہے گی اور حسینیت یزیدیت سے برسرِ پیکار رہے گی۔ اس لیے زیدی کہتے ہیں:

ایسا امیرِ بے نیاز ایسا فقیرِ صف شکن وہ جس کا عکس اک آئنہ وہ جس کی ذات اک انجمن
وہ تاج دارِ بے کلہ وہ بادشاہِ بے وطن لاکھوں گلیموں میں نمایاں جس کا میلا پیرہن
جو آتشیں ماحول میں گلزار کی خاطر گیا جس کا نشیمن خود کڑکتی بجلیوں پر گر گیا (۱۸)

''کربلا اے کربلا'' میں کرداروں کی خصوصیت کو بھی عمدگی سے واضح کیا ہے۔ مثال کے طور پر امامِ حسینؑ کی مدح محض اس لیے نہیں کی کہ وہ نواسۂ رسولؐ ہیں یا جوانانِ جنت کے سردار ہیں بلکہ ان کے وہ اوصاف اجاگر کیے گئے ہیں جو انھیں ایک مصلح، ہمدردِ ملت، دلیر و شجاع اور ہر حال میں ثابت قدم، باطل کے خلاف، ظلم کے مقابل نبرد آزما بناتے ہیں:

سب رہبروں سے مختلف جس کا شعارِ رہبری چشم و چراغِ مصطفیٰ نورِ نگاہِ حیدری
جس کے عَلم میں کہکشاں جس کے قدم میں سروری جس کی امامت سے فروزاں شعلۂ پیغمبری
جس کا لہو بہرِ فروغِ شمعِ علم و فن گیا جو جان دے کر اہلِ حکمت کا محافظ بن گیا (۱۹)

یہ حقیقت ہے کہ کربلا کے معرکے میں امام حسینؑ کا کردار نا صرف مرکزی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ اگر مرثیے کو بطور رزمیہ دیکھا جائے تو ایک ہیرو کی حیثیت سے بھی نمایاں ہوتا ہے۔ مرثیوں میں پیش آنے والے واقعات چاہے وہ رزمیہ پیرائے میں ہوں یا بینیہ امام حسینؑ ایک منفرد رہنما کی حیثیت سے ہر زاویے سے نمایاں ہیں۔ (۲۰)

میدانِ رزم و بزم کی پشت پناہ آخریں برہان کی علت دیانت دار عقلوں کا مبیں
رہبر طریقت کا، جراحت کا طبیبِ نکتہ بیں اپنی صداقت کا کفیل، اپنی دلیلوں کا امیں
وہ جس کا خونِ برگزیدہ ریزۂ الماس تھا جوہر اکھڑتی سانس، ہر گرتے عَلم کے پاس تھا (۲۱)

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اس ضمن میں ''کربلا اے کربلا'' میں اصحابِ باوفا، امام حسینؑ کے جاں نثار رفقا کی وہ خصوصیات اُجاگر کی گئی ہیں جو انھیں اس دور کے دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جن کے لیے دنیاوی مال و متاع اپنے وقت کے امام کا ساتھ دینے کے مقابل ہیچ ہے۔ یہ وہ چندافراد ہیں جو اپنے عزم و حوصلے اور جواں مردی سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو زیر کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے زیدی کہتے ہیں:

وہ لوگ جو ہر سانس لیتے ہیں ہدایت کے لیے — اپنی مثالیں پیش کرتے ہیں قیادت کے لیے
آنکھیں گنوا دیتے ہیں، دنیا کی بصیرت کے لیے — راتیں جلا دیتے ہیں صبحِ آدمیت کے لیے
للکارتے ہیں سنگ کو، شیشہ گری کے واسطے — لڑتے ہیں تجدیدِ اصولِ آشتی کے واسطے

رن کانپتا تھا جب یلان بیشۂ جرأت لڑے — کم سن بھی اپنے مقتدر اسلاف کی صورت لڑے
اک فلسفے کے واسطے اک دین کی بابت لڑے — اشرف ترینِ ہادیانِ مسلکِ وحدت لڑے
تیغوں کے لہرانے پہ ہنستے تھے دلاور آدمی — لاکھوں کی طغیانی پہ بھاری تھے بہتر آدمی(۲۲)

مصطفیٰ زیدی کے ''کربلا اے کربلا'' کے مطالعے کے دوران بارہا جوش ملیح آبادی کا مرثیہ ''عظمتِ انسان'' یوں بھی تحقیق کا حصہ رہا ہے کہ جوش ملیح آبادی نے اپنے مرثیے ''عظمتِ انسان'' کے آغاز میں متعدد بند حرمت و عظمتِ قلم کے لیے نظم کیے ہیں یہاں تک کہ پھر انسان کی عظمت کو قلم کے کردار سے مربوط کر دیا ہے۔ گویا یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ قلم کا تعلق انسان کے کردار سے براہِ راست ہے۔ قلم کو ہرگز خاموش نہیں رہنا چاہیے، قلم علم کی زبان بن کر انسان کو اس کے حق کا ادراک بھی کرا سکتا ہے، یہ حق حاصل کرنے کے لیے زمینہ سازی بھی کر سکتا ہے۔ بقول جوش:

اے قلم مسئلہ میزان و معارف مقیاس — علم بنیاد و ہنر محور و ادراک اساس
فکر پیما و نظر ناقد و فرہنگ شناس — مشعلِ قصرِ ادب مشرقِ صبحِ قرطاس
نام تیرا سببِ جنبشِ لب ہائے رسولؐ — اے قلم موت کے لمحے کی تمنائے رسولؐ

مصطفیٰ زیدی نے بھی اپنے مرثیے کے کئی اشعار میں قلم کو بطور ناصح و مبلغ پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے ان کے پیشِ نظر یقیناً جوش کے افکار ضرور رہے ہوں گے جس کی بنا پر قلم کی فعالیت کے حوالے سے انھوں نے اشعار نظم کیے ہیں۔

ISSN: 2519-6332 (Print),   ISSN: 2708-1915 (Online)

چناں چہ وہ قلم کی عظمت، اس کے افعال کو متحرک اور اہمیت کو نمایاں کرتے نظر آتے ہیں، کئی اشعار ایسے ہیں کہ جس میں انھوں نے قلم کی افادیت کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ اگر قلم کار اپنی جنبشِ قلم اور روانی درست سمت میں رکھے تو زمانے کا شعور بیدار ہوسکتا ہے، عوام میں تحرک کی لہر پیدا ہوسکتی ہے جیسا کہ آغاز سے ہی ظاہر ہو رہا ہے:

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی(۲۳)

یا پھر یہ:

بے حس، خنک الفاظ میں سوزِ دروں پیدا ہوا
لاکھوں پہاڑوں کے صدف میں بے ستوں پیدا ہوا(۲۴)

درد لب و مژگاں نہیں کربِ حریمِ دل ہے یہ
لوح و قلم کے عجز کی سب سے بڑی منزل ہے یہ(۲۵)

وہ قلم کو معاشرے میں انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ایسا محرک سمجھتے ہیں کہ جس کی بنا پر قوموں کی ذہن سازی ہوسکے۔ اور سمجھتے ہیں کہ جہاں قلم کو درست طور پر نہ برتا جائے تو وہاں گویا صورتِ حال کچھ یوں ہوتی ہے:

سو داستانوں کا سبب اُجڑے ہوئے لوح و قلم(۲۶)

ان کے نزدیک قلم وہ تلوار ہے جو باطل کا سر کاٹنے کی قوت رکھتی ہے، ایک ایسا ہتھیار جس کے آگے دنیا کا اسلحہ زیر ہوجائے۔ ایک ایسی زبان جو حق کو حق کہے اور باطل کو سرنگوں کردے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر قلم کا درست استعمال کیا جائے تو قومیں ترقی کی راہ پر گویا یوں گامزن ہوجاتی ہیں:

وہ لوگ بھی، وابستہ ہے جن سے زمانے کی روش   ہوتی ہے ضرب المثل جن کے گرم لہجے کی تپش
حالات کا منہ موڑ سکتی ہے جن آنکھوں کی خلش   خاموش ہوجاتے ہیں پیشِ قوتِ داد و دہش
کتنے ہی ملکوں کی ترقی رائگاں جاتی نہیں   ان کے قلم اٹھتے تو تلواروں پہ دھار آتی نہیں(۲۷)

مصطفیٰ زیدی اپنے اسلوبِ بیاں، طرزِ نگارش، لفظیات و تراکیب کی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے انفرادیت برقرار رکھی۔ نیز انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں کو صرف کرتے ہوئے شعوری طور پر کچھ نئے تجربات بھی کیے۔ مثال کے طور پر ''کربلا اے کربلا'' کے لیے انھوں نے جو بحرِ اختیار کی وہ عام مروّجہ بحروں سے جدا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے افکار کو نیا اسلوب دینے کی بھی کوشش کی۔ یہ نکتہ بھی باعثِ توجہ ہے کہ انھوں نے واقعۂ کربلا

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کے مختلف گوشوں، احوال و مناظر کو نثر میں قلم بند بھی کیا تھا جن کی بنیاد پر وہ ''کربلا اے کربلا'' کا تدریجی لحاظ سے ربط و تسلسل قائم کرتے ہوئے مرثیے کے قالب میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ۱۵۰ سے زائد بند لکھے۔ اس کے علاوہ ان میں ربط و تسلسل قائم کرنے کے لیے ان پر مخصوص نشانات بھی لگائے تھے۔ تاہم ان کی بے وقت موت اور نامکمل اور منتشر بندوں کی وجہ سے ''کربلا اے کربلا'' جدید مرثیے کے ذیل میں تحقیقی و تنقیدی سطح پر نہ اُبھر پایا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس نامکمل مرثیے میں ہی جامعیت کا تاثر ہے جو اسے ادھورے پن کے احساس سے بالاتر بنا دیتا ہے۔ ''کربلا اے کربلا'' کے بند مختلف زاویوں اور جہتوں میں ایک محقق کے لیے نئے ابواب کھولتے ہیں۔ اگرچہ ''کربلا اے کربلا'' کا شمار کلاسیکی مرثیوں میں نہیں کیا جا سکتا تاہم وہ اعلیٰ اخلاقی روایات جن کا درس کلاسیکی مرثیوں کا خاصہ رہا ہے کہ جس کی بنا پر حالی نے ان مراثی کو اردو شاعری میں بہترین و اعلیٰ اخلاقی نظمیں قرار دیا،(۲۸) اس مرثیے میں کئی زاویوں سے نمایاں ہیں۔ شہدائے کربلا کے کردار، ان کے شخصی اوصاف کو اس طرح بیان کیا ہے کہ بصیرت افروز انسانی تعلیمات کا درس بھی نظر آتا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

ابرِ کرم، نیساں قدم، کہسار قامت آدمی — گلشن بکف، گوہر طلب، بارانِ رحمت آدمی
لوحِ صداقت آدمی مہرِ نبوت آدمی — دارالامارت کے ولی، درویش سیرت آدمی
وہ تشنہ لب جو خود سمندر کا دہانہ پاٹ دیں — وہ موج جیسے دل جو تلواروں کا لوہا کاٹ دیں(۲۹)

یا یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جن کو سکھایا تھا شجاعت نے دیانت کا سبق — تقریر کیسی، جن کی خاموشی بھی تھی اعلانِ حق
کھولا جنھوں نے مصحفِ تہذیب کا زرّیں ورق — جن کی نگاہوں میں نئی دنیا کے ناپیدا اُفق
وہ جن کے استقبال کو لاکھوں قرآں رک جائیں گے — وہ جن کا نام آتے ہی اہلِ دل کے سر جھک جائیں گے(۳۰)

یہاں اخلاقی اقدار اس بلندی پر دکھائی دیتی ہیں کہ جہاں عزت و احترام، زور زبردستی اور خوف کی وجہ سے نہیں کیا جاتا بلکہ سیرت کے خوب صورت پہلو جو دشمن کو بھی دوست بنا لیں جو بارگاہِ حق میں سرِ تسلیم خم کر لیں۔ ہر دردمند دل خود بخود تعظیم میں جھک جائے۔ یہ سماجی و تہذیبی اقدار ''کربلا اے کربلا'' میں حالاتِ حاضرہ اور دنیا کے لحہ بہ لحہ تغیر پذیر حالات سے متاثر بھی ضرور ہوتی ہیں۔ اسی لیے کربلا کے تناظر میں مصطفیٰ زیدی نے حوادثِ زمانہ اور مسائل کی جانب نشان دہی بھی کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار دنیا سے علاحدہ، بے خبر ہو کر اپنی تخلیقات کو محض ذاتی تسکین کا ذریعہ تو بنا سکتا ہے اور اس میں دل نشینی تو ہو سکتی ہے، تاہم اثر آفرینی نہیں۔ اسی لیے اہلِ فن کو اپنی تخلیقی کاوشوں میں حالاتِ حاضرہ کو بھی جگہ دینی چاہیے اور ان رجحانات کو بھی نمایاں کرنا چاہیے جو

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

عہدِ حاضر کا حصہ ہوں۔ اس لیے کہ اگر ادیب اپنے معاشرے سے لاتعلق ہوجاتے ہیں تو ان کی تخلیقات بے ڈھنگی و بے روح ہوجاتی ہیں۔ تاہم مصطفیٰ زیدی کے مرثیے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں معاشرے کے اجتماعی طرزِ فکر اور سماجی مسائل کا گہرا ادراک تھا۔ حالاتِ حاضرہ پر ان کی عمیق نگاہ تھی۔ عالمی جنگوں کی ہول ناکیوں اور انسانی جانوں کے بے دریغ ضیاع کو وہ دورِ حاضر کے اہم مسئلوں میں شمار کرتے ہیں:

وہ جرمنی کا آشوز جاپان کا ہیروشما ان کی بھیانک نزع کی آواز کو کس نے سنا
ان کے تو لاکھوں دوست تھے لیکن یہ خونیں سانحا ان کے لیے علمی مباحث کے سوا کچھ بھی نہ تھا
اپنی دیانت کے علاوہ سب سے پردہ پوش تھے سب جیسپر مارکر و سب سارتر خاموش تھے[۳۱]

مصطفیٰ زیدی ایٹمی دور کی تباہ کاریوں کو بدترین تباہی قرار دے رہے ہیں تاہم ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر المیہ یہ ہے کہ جب دنیا ان جنگوں کی زد میں تھی تو اس وقت اہلِ دانش نے مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لی تھی جس کی وجہ سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اگر یہ اہلِ علم و ہنر مجرمانہ خاموشی اختیار نہ کرتے تو اہلِ دنیا کے حقوق کی پامالی ہونے کے بجائے پاس داری ہوتی۔ اس مرثیے کا ایک انتہائی خاص نکتہ یہ ہے کہ اگر صاحبِ علم و قلم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار دنیا میں جاری ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں کریں تو یقیناً انسانوں کو کبھی ظلم و تباہی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لہٰذا وہ قلم اور اہلِ قلم کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ لوگ بھی، وابستہ ہے جن سے زمانے کی روش ہوتی ہے ضرب المثل جن کے گرم لہجے کی تپش
حالات کا منہ موڑ سکتی ہے جن آنکھوں کی خلش خاموش ہوجاتے ہیں پیش قوت داد دہش
کتنے ہی ملکوں کی ترقی رائگاں جاتی نہیں ان کے قلم اٹھتے تو تلواروں پہ دھار آتی نہیں[۳۲]

یہاں زیدی اس زبان کی جانب اشارہ کر رہے ہیں جو کبھی قلم کی نوک سے جاری ہوتی ہے تو کبھی ہونٹوں کی جنبش سے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ اگر حالات کے پیشِ نظر مصلحت آمیز چُپ سادھ لی جائے اور حق کو ظاہر کرنے کے بجائے مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی جائے تو یہ گویا ظالم کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا وہ اس خاموشی کو قاتل کی ہنسی سے زیادہ ایذا رساں قرار دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اہلِ کوفہ کی بے وفائی کا راز بھی اس خاموشی کو قرار دیتے ہیں جس کے تحت یہ کہا گیا انھوں نے امام کا ساتھ نہیں دیا۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

سارے جرائم سے بڑی ہے یہ مہذب خامشی
اس کے تو آگے ہیچ ہے قاتل کی زہریلی ہنسی

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

اس علم کے ساغر میں شامل ہے ہلاکت علم کی
اس سے زیادہ اور کیا سنگین ہوگی روشنی
تاریخ پوچھے گی کہ جب مہمان ویرانے میں تھے
کوفے کے سارے مرد کس گھر کے نہاں خانے میں تھے(۴۳)

''کربلا اے کربلا'' میں مصطفیٰ زیدی نے اکسٹھ ہجری میں امام حسینؑ کا ساتھ نہ دینے والوں کو تو تنقید کا نشانہ بنایا ہی ہے، تاہم ساتھ ہی ساتھ عہدِ حاضر کے ہر اہلِ ضمیر و اہلِ دانش کو بھی خود احتسابی کے امتحان میں مبتلا کر دیا ہے کہ کہیں دولت اور اختیارات اہلِ ثروت کے لیے بزدلی کا باعث تو نہیں، کہیں علم و ہنر اہلِ ضمیر کی راہِ حق میں رکاوٹ تو نہیں:

نبضوں میں کیسے بجھ گیا تھا نوجوانوں کا لہو؟
کتنے مسلمانوں کے گھر میں گرم تھی بزمِ سبو
برقعے میں کیسے چھپ گئی تھی آدمی کی آبرو؟
کیا کر رہی تھیں مسجدوں میں غیرتیں ان کی وضو؟
نکلے تھے جب وحشی درندے زندگی کو چھیننے
کیا چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں عالمانِ دین نے؟

آگے چل کر کہتے ہیں:

اور یاد رکھنا اے مرے ہم عصر اربابِ ذکا
ہم پر بھی گر طاری رہا عالم سنہرے خواب کا
کل ہم بھی ہوں گے روبرو ہم سے بھی پوچھا جائے گا
سننا پڑے گا ہم سبھی کو کربلا کا فیصلہ
قاتل تو شاید عفو کے قابل ہوں، وہ مجبور تھے
ہم دوست ہوکر کیوں ضمیرِ ارتقا سے دور تھے(۴۴)

یہاں اس مرحلے پر حق و باطل کے مابین معرکے میں حق کا ساتھ نہ دینے والوں کا سبب مصطفیٰ زیدی نے ''خوف'' قرار دیا ہے۔ یہ وہ نفسیاتی نکتہ ہے جو نہ صرف ماضی میں نفسیات دانوں کے لیے قابلِ غور رہا ہے بلکہ موجودہ زمانے میں بھی خوف کا عفریت ہم سے حق گوئی اور استقامت کی صلاحیتیں چھین لیتا ہے۔ اور ہم چاہنے کے باوجود بسا اوقات حق کا ساتھ محض اس لیے نہیں دیتے کہ ہمیں کئی طرح کے خدشات لاحق ہوتے ہیں اور ان

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

میں سب سے اہم اور اٹل حقیقت موت کا خوف ہے۔ جبھی زیدی کہتے ہیں:

انسان کے ہر خوف پر بھاری ہے اس صورت کا ڈر
ہر مرحلے سے سخت تر ہے موت کی تنہا سحر(۳۵)

مصطفیٰ زیدی کے نزدیک انسان ساری زندگی موت کے ڈر سے کھل کر زندہ بھی نہیں رہ پاتا اور وقتی حالات سے گھبرا کر حق سے دور ہو کر باطل کا پیروکار ہو جاتا ہے:

آئینۂ صدق و صفا میں باوجودِ صد یقیں
خوف، آدمی کو اپنی صورت دیکھنے دیتا نہیں
آتی ہے جب وقتی یزیدیت پلٹ کر آستیں
گھبرا کے جھک جاتی ہے ہر اک وقتی چوکھٹ پر جبیں
اپنی قبائے زندگی کے چاک سیتے بھی نہیں
ہم موت سے اس درجہ خائف ہیں کہ جیتے بھی نہیں(۳۶)

اگلے ہی بند میں مصطفیٰ زیدی اپنے مخصوص انقلابی طرزِ فکر کا اظہار اس صورت میں کرتے ہیں، اگر انسان اس خوف کو تسخیر کر لے، موت کو برحق سمجھتے ہوئے حق کا ساتھ دینے سے گریز نہ کرے تو یقیناً اس کا نام تاریخ میں رقم ہو جاتا ہے۔ تاہم اس راہ میں ثابت قدمی اور جرأت اس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب خوف کا ادراک کرتے ہوئے مصطفیٰ زیدی عوام الناس کو حوصلہ مندی اور جرأت کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں:

اس خوف کو تسخیر کر لیں جن جواں مردوں کے دل
ان پر خزانے کھول دیتے ہیں رموزِ آب و گِل
قرنوں کی ضو بنتی ہے ان کی آب و تابِ مستقل
صدیوں کے سر ہوتے ہیں ان کے نقشِ پا سے متصل
آفاق بہرِ سجدہ جھک جاتے ہیں ان کے بام پر
ہر نسل اپنے نام رکھتی ہے انھی کے نام پر(۳۷)

جدید مرثیے کے حوالے سے یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ اس میں بینیہ و بکائیہ رنگ قدرے کم پایا جاتا ہے، تاہم ''کربلا اے کربلا'' کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی نے اس حوالے سے ایک توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں کئی ایسے بند ہیں جو خالصتاً بکائیہ ہیں نیز ان میں حفظِ مراتب، احساسات و جذبات اور منظر کشی کے بہترین جوہر بھی نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

کیسے رقم ہو بے کسی، بے حرمتی کی داستاں
اک کنبۂ عالی نسب کی دربدر رسوائیاں
اک مشک جس کو کر گئی سیراب تیروں کی زباں
اک سبز پرچم جھک گیا جو خاک و خوں کے درمیاں
اک آہ جو سینے سے نکلی اور فضا میں کھو گئی
اک روشنی جو دن کی ڈھلتی ساعتوں میں سو گئی

جب کربلا کے دشت سے نیزوں پہ سر لائے گئے
فتح عظیم الشان کے اعلان فرمائے گئے
باگوں کا رخ موڑا گیا خیمے اتروائے گئے
قرآن کے سارے ورق شعلوں پہ پھیلائے گئے
جلتی ہوئی موجوں کے دامن میں سفینہ آ گیا
عاشور کے سورج کے چہرے پر پسینہ آ گیا(۳۸)

کربلا کے دشت میں شامِ غریباں کے مناظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ عام طور پر مرثیے کا اختتام شہادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ تاہم مصطفیٰ زیدی نے شامِ غریباں کو انتہائی تفصیل اور اثر انگیزی سے بیان کیا ہے نیز مصائب کو بیان کرنے میں ربط و تسلسل کو برقرار بھی رکھا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ شامِ خونِ بے وطن وہ شام ملبوسِ کہن
شورش، تحیر، رست خیزی، جاں کنی، دیوانہ پن
تضحیک، نفرت، طنطنہ، تعریض، عیاری، جلن
الٹی قناتوں کا سماں، لٹتی رداؤں کا چلن
لٹتی قناتوں میں رواں آتش یزیدی جاہ کی
لٹتی شفقوں میں دربدر عترت رسول اللہ کی
وہ شام جور و ابتلا وہ شام خوف و امتحاں
وہ آہٹوں کی دہشتیں وہ ڈوبتی پرچھائیاں

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

وہ ریت کے ٹیلوں کے اوپر سر جھکائے آسماں
وہ گم شدہ بچوں کی راہیں دیکھتی تنہائیاں
تیر و تبر کا برچھیوں کا کارواں پھیلا ہوا
وہ دور تک لاشوں پہ دشتِ بے اماں پھیلا ہوا(۳۹)

انھی مظالم کو تاریخ کے بدترین حقائق قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جس ہاتھ سے تھپڑ پڑے وہ ہاتھ اک کردار تھا
عارض سکینہ کے نہ تھے، تاریخ کا رخسار تھا(۴۰)

''کربلا اے کربلا'' کے مطالعے میں جو بات شدت سے محسوس کی جاسکتی ہے، وہ اخلاقی اقدار کے وہ مظاہر ہیں جو خاندان رسالتؐ سے تعلق رکھنے والے افراد کے طرزِ زندگی اور اندازِ گفتگو سے عیاں ہیں۔ مثال کے طور پر وہ واقعہ کہ جب اشقیا خیموں میں آگ لگانے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایسے میں امام حسینؑ کی بہن حضرت زینب اپنے بھتیجے علی ابن الحسین جو شہادتِ امام حسینؑ کے بعد امامِ وقت بھی ہیں۔ جو اس وقت شدتِ تپ کی بنا پر عالمِ غشی میں ہیں، اُن سے کہتی ہیں:

سجاد سے زینب کا یہ کہنا کہ مولا جاگیے
غفلت سے آنکھیں کھولیے، لٹتا ہے کنبہ جاگیے
اٹھتے ہیں شعلے دیکھیے جلتا ہے خیمہ جاگیے
سارے محافظ سو رہے ہیں، اشقیا بیدار ہیں
طوق و سلاسل منتظر ہیں بیڑیاں تیار ہیں(۴۱)

''کربلا اے کربلا'' کو اس حوالے سے بھی منفرد نوعیت کا قرار دیا جاسکتا ہے کہ جوشؔ سے متاثر ہونے کے باوجود مصطفیٰ زیدی نے تراکیب ولفظیات میں انفرادیت برقرار رکھی ہے۔ بلاشبہ اگر کوئی شاعر یہ جستجو نہ کرے تو اس کے کلام میں نہ صرف اثر انگیزی کا فقدان ہوگا بلکہ اس کا تخیل بھی ابھر کے سامنے نہ آسکے گا۔ یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ پُرشکوہ لفظیات، نادر تراکیب اور چست مصرعوں کے انتخاب میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ موزونیت اور مناسبت کا ہونا بھی ضروری ہے ورنہ کلام کی روانی وتسلسل میں رکاوٹ و ناہمواری محسوس ہوگی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کی یہ رائے اہمیت کی حامل ہے کہ:

> ایسے لفظ جمع کیے جائیں جن کو ادا کرنے میں زباں رکتی نہ ہو۔ کلام کی اس خوبی کو صفائی اور روانی کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لفظوں کی آواز انفرادی اور مجموعی حیثیت

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

سے کانوں کو ناگوار نہ ہو۔[۴۲]

اس رائے کی روشنی میں ''کربلا اے کربلا'' کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مصطفیٰ زیدی نے مرثیے میں محض الفاظ کا ذخیرہ ہی جمع نہیں کر دیا بلکہ وہ منفرد لفظیات کو مناسبت سے برتنے کا ادبی شعور بھی رکھتے تھے اور سلیقہ بھی۔ جیسے شامِ وفاداران طوق و دار، پتھر کی رگ، صبح اذان سیّد ابرار، پہاڑوں کے صدف میں بے ستوں کا پیدا ہونا، اخترشکاران مدینہ، شب چراغانِ نجف، راز بطون امتحان، احساس کی جلد، اوندھی لکیریں، نامناسب زاویے، ترچھے سبق، آواز کی بے ربط قوسیں، اُجڑے ہوئے نکتوں کے بے ترتیب گیسو، حرفوں کی کروٹ، یہ وہ چند مثالیں ہیں جن سے مصطفیٰ زیدی کے تخلیقی ذہن و تحقیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز تشبیہات و استعارات، لطیف کنایوں اور تلمیحات کو بھی اس خوبی سے برتا گیا ہے جو واقعات کی جاذبیت و اثر انگیزی بڑھانے کا باعث بنی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

فرشِ زمیں پر بچھ گئی تھی منتخب تاروں کی صف
وہ ثابت و سیّار کے موتی، کواکب کے صدف
جود و سخا کی تاب سے سینے خزانوں کی طرح
چہرے صحیفوں کی طرح باتیں اذانوں کی طرح[۴۳]

''کربلا اے کربلا'' کے دستیاب شدہ بند یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر یہ مرثیہ مکمل ہوکر منظرِ عام پر آتا تو یقیناً ادبی دنیا میں گراں قدر حیثیت و وقعت کا حامل بنتا۔ تاہم زیرِ تحقیق مندرجہ بالا نکات کی بنا پر ڈاکٹر ہلال نقوی نے اس مرثیے کو فیضؔ اور صادقینؔ کے مرثیوں پر ترجیح دی ہے۔[۴۴] ادھورا و نامکمل سہی، تاہم بیسویں صدی میں جدید مرثیہ نگاری کے باب میں اسے ایک اہم تجرباتی پیش رفت قرار دیا جاسکتا ہے۔

حواشی

۱۔ فراق گورکھ پوری، ''پیش لفظ''، ''زنجیریں'' مشمولہ ماہ نامہ ''افکار'' کراچی، مصطفیٰ زیدی نمبر، شمارہ ۹، دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۴، بار دوم

۲۔ ڈاکٹر سیّد محمد عقیل، ''تیغ الٰہ آبادی: ایک اہم جماعت، ایک دوست'' مشمولہ ''ایک تھا راجا''، (لاہور: شمیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۳ء)، ص ۲۴۵، ۲۴۶، باراوّل

۳۔ فیض احمد فیض، ''مصطفیٰ زیدی: فیض احمد فیض کی نظر میں'' مشمولہ ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، مصطفیٰ زیدی نمبر، ص ۳۱۱

۴۔ مصطفیٰ زیدی، ''شہرِ آذر''، (راول پنڈی: ماورا پبلشرز، سنہ ندارد)، ص ۱۶

۵۔ ڈاکٹر ممتاز حسین، ''مصطفیٰ زیدی مرحوم'' مشمولہ ''نقش''، کراچی، 'مصطفیٰ زیدی نمبر'، شمارہ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء، ص ۶۸

۶۔ مصطفیٰ زیدی، ''کوہِ ندا''، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اکتوبر ۱۹۹۸ء)، ص ۷۰

۷۔ ڈاکٹر احسن فاروقی، ''ایک بڑا شاعر، ایک ذہین انسان''، مشمولہ ''نقش''، کراچی، 'مصطفیٰ زیدی نمبر'، ص ۱۵۸

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۸۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' (لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ لندن، ۱۹۹۴ء)،ص ۵۰۷، بار اوّل

۹۔ پروفیسر منظر ایوبی، ''نئی پرانی آوازیں''، (کراچی: شاداب اکادمی، ۱۹۹۸ء)،ص ۴۷، بار اوّل

۱۰۔ مصطفیٰ زیدی، ''موج مری صدف صدف''، (لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۰ء)،ص ۹۱، بار اوّل

۱۱۔ ایضاً، ''روشنی''، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)،ص ۱۰۷

۱۲۔ ارتضیٰ زیدی، ''میرا بھائی''، مشمولہ ''ایک تھا راجا''، ص ۳۰۴

۱۳۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ''مرثیے کی نایاب آوازیں'' (کراچی: الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء)،ص ۳۱، بار اوّل

۱۴۔ ایضاً،ص ۴۱

۱۵۔ احمد علی سیّد، ''کچھ یادیں کچھ باتیں'' مشمولہ ''ایک تھا راجا''، ص ۳۵۴

۱۶۔ ارتضیٰ زیدی، ''میرا بھائی''، ص ۳۰۵

۱۷۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ''جوش ملیح آبادی: ایک مطالعہ'' (کراچی: ارتقا، ۲۰۰۶ء)،ص ۱۲۴

۱۸۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ''مرثیے کی نایاب آوازیں''، ص ۵۲

۱۹۔ ایضاً،ص ۵۳

۲۰۔ ڈاکٹر جعفر رضا، ''دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی''، (الٰہ آباد: نیشنل کتاب گھر، ۱۹۷۳ء)،ص ۱۷۳

۲۱۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ''مرثیے کی نایاب آوازیں''، ص ۵۳

۲۲۔ ایضاً،ص ۴۹

۲۳۔ www.rekhta.org/marsiya/azmat-e-insaan-josh-malihabadi-marsiya?lang=ur

۲۴۔ ایضاً،ص ۳۹

۲۵۔ ایضاً،ص ۴۲

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ ایضاً،ص ۴۶

۲۹۔ مولانا الطاف حسین حالی، ''مقدمہ شعر و شاعری''، (لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۱ء)،ص ۱۵۰

۳۰۔ ڈاکٹر ہلال نقوی، ''مرثیے کی نایاب آوازیں''، ص ۴۹

۳۱۔ ایضاً،ص ۵۰

۳۲۔ ایضاً،ص ۴۷

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً،ص ۴۸

۳۶۔ ایضاً

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ ایضاً،ص ۴۳

ISSN: 2519-6332 (Print), ISSN: 2708-1915 (Online)

۳۹۔ ایضاً،ص ۴۵
۴۰۔ ایضاً،ص ۴۴
۴۱۔ ایضاً،ص ۵۵
۴۲۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب،''ہماری شاعری''، مرتبہ ایس ایم شفیق، (لاہور: نذر سنز، ۱۹۸۶ء)،ص ۹۴، طبع اوّل
۴۳۔ ڈاکٹر ہلال نقوی،''مرثیے کی نایاب آوازیں''،ص ۵۱
۴۴۔ ایضاً''جدید مرثیہ اور بیسویں صدی''،ص ۸۴۷

مآخذ

۱۔ ادیب، مسعود حسن رضوی، پروفیسر،''ہماری شاعری''، مرتبہ ایس ایم شفیق، لاہور: نذر سنز، ۱۹۸۶ء، طبع اوّل
۲۔ ایوبی، منظر، پروفیسر،''نئی پرانی آوازیں''، کراچی: شاداب اکادمی، ۱۹۹۸ء، باراوّل
۳۔ حالی، مولانا الطاف حسین،''مقدمہ شعر و شاعری''، لاہور: خزینۂ علم و ادب، ۲۰۰۱ء
۴۔ رضا، جعفر، ڈاکٹر،''دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی''، الہٰ آباد: نیشنل کتاب گھر، ۱۹۷۳ء
۵۔ زیدی، ارتضیٰ،''میرا بھائی'' مشمولہ''ایک تھا راجا''،ص ۳۰۴
۶۔ زیدی، مصطفیٰ،''شہرِ آذر''، راول پنڈی: ماورا پبلشرز، سنہ ندارد
۷۔ ____،''کوہِ ندا''، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، اکتوبر ۱۹۹۸ء
۸۔ ____،''موج مری صدف صدف''، لاہور: لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۰ء، باراوّل
۹۔ ____،''روشنی''، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء،ص ۱۰۷
۱۰۔ سیّد، احمد علی،''کچھ یادیں کچھ باتیں'' مشمولہ''ایک تھا راجا''،
۱۱۔ صدیقی، محمد علی، ڈاکٹر،''جوش ملیح آبادی: ایک مطالعہ''، کراچی: ارتقا، ۲۰۰۶ء
۱۲۔ عقیل، سیّد محمد، ڈاکٹر،''تیغ الہٰ آبادی: ایک اہم جماعت، ایک دوست'' مشمولہ''ایک تھا راجا''، لاہور: شمیم پبلی کیشنز، ۱۹۷۳ء، باراوّل
۱۳۔ نقوی، ہلال، ڈاکٹر،''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ''، لندن/کراچی: محمدی ٹرسٹ لندن، ۱۹۹۴ء، باراوّل
۱۴۔ ____،''مرثیے کی نایاب آوازیں''، کراچی: الفاظ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۱ء، باراوّل

رسائل و جرائد

۱۔ ''افکار'' (ماہ نامہ)، کراچی، مصطفیٰ زیدی نمبر، شمارہ ۹، دسمبر ۱۹۷۰ء، بار دوم
۷۔ ''نقش''، کراچی، مصطفیٰ زیدی نمبر،ص ۱۵۸

ویب سائٹس

۱۔ www.rekhta.org/marsiya/azmat-e-insaan-josh-malihabadi-marsiya?lang=ur